

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

پچھلے مہینے دو ستمبر ۶۶ء کے آغاز میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا یہ اجتماع قریب قریب ایک ہفتہ تک رہا۔ اس میں معمول کے مطابق جماعت کے گذشتہ سال کے پورے کام کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ سال کے لیے پروگرام طے کیا گیا۔

جماعت اسلامی کے دستور کی رُو سے اُس کی مجلس شوریٰ اُس کے نظام کا سب سے زیادہ با اختیار ادارہ ہے جس کو ارکان جماعت اپنے براہ راست ووٹوں سے منتخب کرتے ہیں اور ارکان کے اجتماع عام کی غیر موجودگی میں یہی مجلس اس کی پوری تنظیم اور تحریک کو کنٹرول کرتی ہے۔ اجتماع ارکان کے بعد یہ جماعت کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ مقتدر مجلس ہے۔ یہی جماعت کے پورے کام کی نگرانی کرتی ہے اور یہی اُس کی جدوجہد کے خطوط متعین کرتی ہے۔ اس کے فیصلوں کا جماعت کا ہر ذمہ دار پابند ہے۔ اگرچہ جماعت کے نظام میں اختیار کے اصل امین ارکان جماعت ہیں لیکن چونکہ اتنی بڑی اور تمام ملک میں پھیلی ہوئی تعداد کو ہر وقت جمع کرنا اور ہر مسئلے پر اس سے مشورہ لینا قریب قریب ناممکن ہے اس لیے جماعت کے دستور میں انہیں اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی اس امانت کو ایک متعین مدت کے لیے ایک منتخب مجلس (یعنی مجلس شوریٰ) کے سپرد کر دیا کریں۔ اسی بنا پر اس مجلس کے فیصلے و حقیقت جماعت اسلامی کے فیصلے ہی خیال کیے جاتے ہیں اور انہیں صرف جماعت کے اندر ہی نہیں بلکہ ملک میں بھی جماعتی فیصلوں کی حیثیت دی جاتی ہے۔

اسی بنا پر مجلس شوریٰ کا اجلاس جماعتی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مجلس جس طریقہ سے ملکی اور جماعتی حالات کا جائزہ لیتی اور آئندہ کے لیے کام کا نقشہ تیار کرتی ہے وہ جماعت کے ارکان اس کے ہمدردوں اور بھائیوں اور پورے ملک کے لیے بڑے دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ ہم اپنی گفتگو کا آغاز مجلس شوریٰ کے اُس جائزہ سے کرتے ہیں جو اُس نے ملکی صورتِ حال پر غور کرتے ہوئے پیش کیا ہے، کیونکہ جب تک ہمارے سامنے وہ میں منظر لڑی طرح نہیں آجاتا جس میں جماعت کام کر رہی ہے ہم جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے۔ مجلس شوریٰ کے اس معاملے میں جو تاثرات تھے اُن کی ترجمانی میاں طفیل محمد صاحب نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

”اس دوران میں کام کی راہ میں جو مشکلات حائل رہیں اور سامنے آئی ہیں ان میں خارجی مشکلات بھی ہیں اور داخلی بھی۔ خارجی مشکلات میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ رابطہ عوام کے ذرائع اور سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں پر روز افزوں پابندیوں نے عام باشندگان ملک کو اس بات سے قریب قریب مایوس کر دیا ہے کہ آئینی اور جمہوری طریقوں سے بھی یہاں اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔ قانونِ تحفظِ عامہ، کریمنل لائسنڈنس ایکٹ، سکیورٹی ایکٹ اور پریس آرڈیننس وغیرہ نے پیچھے ہی شہری آزادیوں کو بڑی حد تک مفلوج کر رکھا تھا، لیکن ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہنگامی حالات کے اعلان اور پھر بنیادی حقوق کی معطلی، ہائی کورٹوں سے براہِ راست فریاد رسی کی درخواستوں پر پابندی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے نفاذ نے تو بالخصوص مغربی پاکستان میں بالکل مارشل لاک کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس پر بھی بس نہیں، اعلانِ تاشقند پر دستخط کر کے صدر پاکستان ابھی تاشقند ہی میں تھے کہ راولپنڈی میں دفعہ ۴۴ نافذ کر دی گئی۔ اور جلسے، جلوس اور مظاہرے تو درکنار کسی کھلی جگہ پر پانچ یا اس سے زائد آدمیوں کا جمع ہونا بھی ممنوع کر دیا گیا۔ اور پھر اس کے بعد سے تو ضابطہ فوجداری کی یہ دفعہ ہی سارے صوبے میں دستور و قانون بن گئی ہے، بعض مقامات پر اب ایک قدم اس سے آگے بڑھا دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بہرِ عام تو کونوار

کسی پرائیویٹ جگہ یا مکان میں بھی کوئی سیاسی اجلاس نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی مینفلٹ، دو دفتر یا اشتہار تقسیم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس طرح کی کوئی شے پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ صوبائی و حکومت میں تو یہ پابندی بھی لگادی گئی ہے کہ کارپوریشن کی اجازت کے بغیر اور اس کے نوٹس بورڈوں کے سوا کسی جگہ نہ تو کوئی چیز چسپاں کی جاسکتی ہے اور نہ لکھی جاسکتی ہے۔

سیاسی جبر کے اس ننگ و تاریک ماحول میں ظاہر بات ہے کہ کوئی تحریک اپنی اجتماعی سرگرمیوں کو جاری نہیں رکھ سکتی۔ جماعت کو قدم قدم پر جن نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مغربی پاکستان کے امیر نے قریب قریب سارے مغربی پاکستان کا دورہ کیا لیکن سوائے ایک ضلعی اجتماع کے کہیں دوسرا اجتماع نہ منعقد کیا جاسکا۔ اور جن منافقین نے اس کی جرأت کی ان سے دو دو ہزار روپے کی ضمانتیں طلب کر لی گئیں۔ ضمانتوں اور پابندیوں کا یہ سلسلہ کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں بلکہ ہر اس مقام پر جہاں ذیاسی سیاسی حرکت پیدا ہوتی ہے اور کوئی ایسا بااثر فرد یا گروہ جو حکومت کا منظور نظر نہ ہو، کوئی بات کہنا چاہتا ہے، وہاں اس نوعیت کی ناروا پابندی فوراً عائد کر دی جاتی ہیں۔ اس معاملے میں اتنی غیر معمولی چوکسی کا ثبوت دیا جاتا ہے کہ بعض مقامات پر تربیت گاہیں تک منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی جن کا مقصد کارکنوں کی ذہنی و اخلاقی اور دینی تربیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ تو سہوٹی اجتماعات پر پابندی۔ قلم پر اس سے بھی زیادہ کڑے اور سخت پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ کسی ایسی چیز کی اشاعت گوارا نہیں کی جاتی جو حکومت کے نقطہ نظر سے مختلف ہو۔ جماعت اسلامی لاہور نے ”اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی“ کو مینفلٹ کی صورت میں طبع کر کے صوے میں پھیلانے کا انتظام کیا تو اسے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ضبط کر لیا گیا۔ اس کے چند روز بعد اسلام اور ضبط و لادقت، کا بھی یہی حشر ہوا۔ یہ تو خیر مینفلٹ اور کتاب کی بات ہے۔ سٹینیل تک کے لگانے میں طبع طرح کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ راولپنڈی میں جماعت کے کارکنوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے بارے

میں چند سٹینسل لگائے تو سی جیٹریٹ صاحب نے انہیں اپنی عدالت میں طلب کر کے ان سے باز پرس کی اور انہیں ڈرا یا دھمکا یا۔ لیکن جب وہ ان دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوئے تو پھر ان کارکنوں کے خلاف سزنا پا جھوٹے اور مضحکہ خیز مقدمے درج کیے گئے جن میں سے ایک یہ تھا کہ ان لوگوں نے خاندانی منصوبہ بندی کا ایک یوٹوچر الیا ہے جن حضرات کے خلاف یہ کارروائی کی گئی ان میں ایک صاحب یونین کونسل کے چیئرمین ایک حلقہ منتقین کے ناظم، ایک قیم جماعت اور دو ارکان جماعت ہیں۔

یہ صورت حال کسی ایک شہر یا ضلع تک محدود نہیں بلکہ ہر جگہ اسی قسم کی جاہرانہ کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ بعض شہروں میں تو جماعت اسلامی کے کارکنوں کے خلاف سیاسی اور جھوٹے مقدمات کا ایک لائننا ہی سلسلہ چل رہا ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں جماعت کے کارکنوں پر پچاس مقدمات بنائے گئے جن میں پچیس افراد کو پھانسا گیا۔ ان میں سے بیالیس مقدمات اب تک خارج ہو چکے ہیں اور باقی چل رہے ہیں۔

صوبے کی انتظامیہ کا مزاج کس حد تک نازک اور حساس ہو چکا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے عقل کی کوئی زیادہ مقدار اور مشاہدہ کی کوئی غیر معمولی قوت درکار نہیں۔ آرڈینیٹوں نے ان کے حوصلے بے حد بڑھا دیئے ہیں اور وہ بڑی دلیری کے ساتھ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ ابھی گزشتہ دنوں اسمبلی ہال کے اندر عین اجلاس کے وقت صوبے کے نمائندوں کی موجودگی میں حکمران پارٹی کے ایک معزز رکن کا ایک سرکاری افسر کے ہاتھوں جو حشر ہوا وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ جب خود سرکار کے حامی ایک ایم پی۔ اے کے ساتھ یہ ظلم و زیادتی ہو سکتی ہے تو غریب عوام کی حالت زار اور ان سیاسی اور سماجی کارکنوں کی بے بسی کا خود اندازہ کیا جاسکتا ہے جو ہر معاملہ میں حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے۔ ان پر جو کچھ بیت رہی ہے اُس کے اظہار سے قلم عاجز ہیں۔ پاکستان کے ایک معروف عالم دین نے صدر چین کی آمد کے موقع پر لڑکیوں کے قص پر گرفت کی تو انہیں ایک گاڑی میں پابند کر دیا گیا۔ ننان میں جشن بہار کے موقع پر کئی ایک علماء اور سماجی کارکنوں کے ساتھ بھی سلوک ہوا۔ اس معاملے میں حکومت کے کاغذ سے اتنے جری اور بے باک ہو گئے ہیں کہ وہ جن لوگوں کو چاہتے ہیں بلاتامل عدالتی کارروائیوں کا نوٹس دے

دیتے ہیں اور ان کی زد میں بسا اوقات ایسے متدین اور خاموش بزرگ بھی آجاتے ہیں جنہوں نے زندگی بھر کبھی بھی کسی سیاسی معاملے میں دلچسپی نہیں لی، حتیٰ کہ کبھی کسی اخبار تک کو نہیں دیکھا، جن کا کام صرف علم دین کی درس و تدریس اور خطبہ جمعہ تک محدود رہا ہے۔

نشر و اشاعت کے جتنے ذرائع ہیں ان میں سے دو سب سے موثر ذریعے یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن براہ راست حکومت کے قبضے میں ہیں اور وہ ہر وقت سرکاری طرز عمل کی تائید میں طب اللسان اور اس کی کارکردگی کے تناخواں رہتے ہیں عوام کے سامنے بجز سرکاری نقطہ نظر کے کوئی دوسرا نقطہ نظر نہیں آتا۔ لے دے کے عوامی شعور و احساس کو سیدھا کرنے والا ایک ذریعہ پریس رہ جاتا ہے۔ لیکن اس کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ ملک کے اکثر و بیشتر روزنامے یا تو پریس ٹرسٹ کی ملکیت میں ہیں یا براہ راست حکومت کی تحویل میں۔ ان بے چاروں کے لیے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے علاوہ کوہ چارہ کاری نہیں۔ ایک آدھ اخبار کو چھوڑ کر یہ سارے کے سارے سرکاری پالیسیوں کی ترجمانی میں مصروف رہتے ہیں۔ اور وہ ایک آدھ اخبار جو کسی حد تک حکومت کے اثر سے آزاد ہے اُسے ہر طرح پریشان کیا جاتا ہے اور اُس کی مختلف طریقوں سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ پریس آرڈی ننس کی نوا ر اس پر ہمیشہ متعلق رہتی ہے جو کسی وقت بھی اُس پر دوار کر کے اُس کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

مشرقی پاکستان کے حالات میں اگرچہ اس حد تک شدت نہیں ہے، مگر آزاد فضا کا وہاں بھی فقدان ہے۔

ان رُوح فرسا حالات اور گھٹن کے اس ماحول میں اگر کوئی تحریک محض زندہ رہ جائے تو یہی غنیمت ہے۔ لیکن ہم اپنے نعم حقیقی کا مصیبت قلب سے شکرا ادا کرتے ہیں کہ اُس نے اس سنگین صورت حال میں بھی ہمارے قافلے کو رواں دواں رکھا اور رفتائے کار نے حکمت و دانائی سے اپنی کوشش کو جاری رکھا۔ اجتماعی جدوجہد کی کمی کو اچھی خاصی حد تک پورا کیا۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل اور اس کی تائید ہے کہ ان حالات میں بھی سال گزشتہ کے دوران میں جماعت کو ڈیڑھ سو کے قریب نئے ارکان اور درس ہزار

تین سو اٹھ متفق پیر آتے۔ قریب قریب ۳۳۲ افراد نے جماعت کی رکنیت کے لیے درخواستیں دے رکھی ہیں اور ان پر غور کیا جا رہا ہے۔ تعداد میں اضافے کی وجہ سے رفتار کا یہیں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ ہوا ہے۔ جماعت نے مختلف مقامات پر ۷۷ نئے دارالطالعے قائم کیے ہیں اور اس طرح اب دارالمطالعوں کی مجموعی تعداد ۱۱۰ تک جا پہنچی ہے۔ شفا خانوں اور سماجی ہیویوڈ کے مراکز کی کارکردگی بھی کافی تیز اطمینان بخش ہے اور اس سال اُن کی تعداد ۳۲ سے بڑھ کر ۷۷ ہو گئی ہے۔

کسی تحریک کی حیثیت ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس کے بہاؤ کو نارا و پابندیاں رک کر نہیں رکھ سکتیں۔ اگر تحریک کے کارکنوں میں اخلاص، اپنے مقصد کے حصول کا جذبہ سادق، اور صبر و حکمت موجود ہوں تو آگے بڑھنے کے راستے خود بخود دکھلتے چلے آتے ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ دنیا کی کسی ایسی تحریک کا، جس کے علمبرداروں کو اپنے مقصد کا شعور اور نسیب العین کے ساتھ عشق تھا، کوئی جبر و استبداد راستہ نہیں روک سکا ہے۔ وہ برابر آگے بڑھتی رہیں اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ قانونی پابندیاں تحریکات کو کبھی دبا نہیں سکتیں۔ وہ صرف اُن کے راستوں میں عارضی رکاوٹیں ہی ڈال سکتی ہیں۔ پھر یہ تو اُن تحریکات کا حال ہے جن کے کام کے میدان بڑے محدود اور جن کے دائرہ کار بڑے تنگ ہیں۔ دینی تحریکیں جو اپنی سرگرمیوں کے لاندہ اور میدان رکھتی ہیں، جن کے فکر و عمل کا دائرہ قلب و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں سے لے کر خارجی زندگی کے سارے گوشوں تک پھیلا ہوا ہے، کوئی قانونی پابندی، کوئی جبر و استبداد اُن کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ مسلسل سرگرم عمل رہتی ہیں اور اپنی توسیع و ترقی کے لیے نئے نئے راستے تلاش کرتی ہیں جس طرح دل زندہ کبھی نہیں اجڑتا بلکہ ہمیشہ باغ و بہار رہتا ہے بالکل اسی طرح کوئی دینی تحریک، جس کے علمبرداروں میں خلوص و تدبیر ہو، کبھی نہیں مرتی۔ وہ ہمیشہ پھلتی پھولتی ہے۔ البتہ اُس تحریک کے ہی خواہوں کو ہر وقت اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ مقصد کی لگن میں کسی طرح کمی نہ آنے پائے۔ کیونکہ یہی چیز اُس کے لیے پیامِ اجل ثابت ہوتی ہے۔

بے جا نہ ہوگا اگر اس موقع پر جہاں ہم اپنے زعماء کی خدمت میں یہ معروضات پیش کر رہے ہیں وہاں اصحابِ اقتدار کی بارگاہ میں بھی اس افسوسناک صورتِ حال کے متعلق کچھ عرض کریں ہم انہیں اس سلسلے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ براہِ کرم تاریخ سے سبق لیں۔ غفلتِ آدمی وہی ہوتا ہے جو دیوار پر لکھی ہوئی نصیحت سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ صحیح حکمرانی لوگوں کی گردنوں پر نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر کی جاتی ہے۔ قانون کا بازو خارجی زندگی کے بھی بیشکل ۵ فیصد حصے تک پہنچتا ہے۔ ۹۵ فیصد حصہ اس کی دسترس سے آزاد رہتا ہے۔ اور داخلی زندگی جو خارجی زندگی سے کہیں زیادہ وسیع اور عمیق ہوتی ہے اس پر تو قانون کا ذرہ برابر بھی بس نہیں چلتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ حیاتِ انسانی کے ایک نہایت ہی معمولی گوشے پر قبضہ کر کے اُس کی پوری زندگی پر قابض ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔ تاریخ میں بڑے بڑے اصحابِ سلطوت و جبروت پیدا ہوئے۔ وہ چند لوگوں کی گردنوں کو تو اپنے سامنے جھکاسکے مگر اُن کے دل کبھی بھی مسخر کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ دلوں کی تسخیر کے لیے ہمیشہ ایک ہی اصول کار فرما رہا ہے کہ سب سے پہلے عوام کے دلوں میں اتر کر اُن کے احساسات و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، پھر انہیں سامنے رکھ کر قومی تعمیر و ترقی کا کوئی جامع منصوبہ بنایا جائے اور اس کے بعد انہیں اس بات کا پورا پورا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اس منصوبے اور اس کے نتائج کے بارے میں اپنے ردِ عمل کو بر ملا ظاہر کر سکیں۔ جن پروگراموں کو عوام کے قلب و دماغ قبول نہیں کرتے اور جن کے بارے میں وہ مختلف خدشات اپنے سینوں میں پالتے ہیں انہیں محض قوت و طاقت کے بل پر آگے بڑھانا کوئی تدبیر نہیں۔ حکومت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بے شمار وسائل آپ کے قبضے میں ہیں۔ نشر و اشاعت کے کم، بیش سارے ذرائع آپ کی تحویل میں ہیں۔ ان وسیع اختیارات کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی ”سمر بھرا“ آپ کے بارے میں عوام کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عوام کسی حد تک جذباتی ہی ہے، لیکن اگر کوئی دوسرا ہر قسم کے وسائل سے محروم ہو کر بھی انہیں اپنے ساتھ لگا سکتا ہے تو آپ اتنے وسیع اختیارات اور اتنے زبردست وسائل رکھنے کے باوجود کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عوام جذباتی ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر دھوکے میں آکر متغفل ہو سکتے

ہیں۔ لیکن وہ پاگل اور دیوانے تو نہیں ہوتے کہ اپنی بھلائی اور بُرائی کے درمیان تیز نہ کر سکیں۔ اگر حکومت کلیہ کام اُن کی بھلائی کے لیے کر رہی ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اس کی افادیت، حکومت کی پوری توضیح و تشریح کے باوجود اُن کے ذہن نشین نہ ہو سکے اور وہ محض چڑا اور ضد میں بہک کر حکومت کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں۔

چند انسانوں کو کچھ وقت تک تو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے لیکن پوری قوم کو ایک لمبی مدت تک بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ اس بنا پر ملک و قوم اور خود اصحابِ اقتدار کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ عوام کو اپنے گھٹے ہوئے احساسات اور دبے ہوئے جذبات کے اظہار کا موقع ملے اور حکومت اُن کی زبانیں بند کرنے اور اُن کی تحریروں پر فغن لگانے کے بجائے اُن کی تکلیفات کو توجہ اور سہ روی سے سنے اور پھر طاقت سے نہیں بلکہ دسوزی اور جذبہٴ اِثار کے ساتھ انہیں دُور کرے۔ تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد کرنے سے بلاشبہ حکومت کے حساس کان ناخوشگوار باتیں سننے سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن آخر جذبات کے اُن طوفانوں کا کیا بنے گا جو انسانی سینوں کے اندر تلاطم پیدا کریں گے۔ ان کو بہنے کے لیے اگر آئین کے راستے کھلے نہ ملیں گے تو تعبید نہیں کہ کسی وقت وہ غیر آئینی راستوں پر نہ نکلیں۔ یہ چیز انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ دکھ اور تکلیف سے لاپار اور پریشان ہوتا ہے اور خوشی سے اُسے سکون اور آرام میسر آتا ہے۔ جب عوام بعض ناقابلِ برداشت مصائب سے دوچار ہیں تو وہ لازمی طور پر آہ و فغان کریں گے۔ یا تو اُن کے مصائب اور پریشانیوں کو دُور کیجیے، اور اس طرح اُن کے کرب و اضطراب کو سکون اور آرام سے بدلنے کی کوشش کیجیے، یا جن لوگوں پر انہیں اعتماد اور بھروسہ ہے انہیں اس بات کا موقع دیجیے کہ وہ انہیں مطمئن کر سکیں۔ اور اگر آپ یہ بھی نہیں کرنا چاہتے تو ان کو کم از کم اس بات کا حق تو دیجیے کہ وہ اپنی تکلیف بیان کر سکیں اور اُن حالات کو آپ کے سامنے لاسکیں جو ان کے لیے وجہ شکایت ہیں۔ اس سے انہیں کم از کم یہ تسکین تو ہوگی کہ آپ ان کی تکلیفات سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

آج پوری دنیا نے مشرقِ انسانوں کی بستی معلوم نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسا آتش فشاں معلوم ہوتی ہے

جو ہر وقت زیرِ وزیر ہو رہا ہے اور جس میں پیہم انقلابات اور تبدیلیوں نے اسے جہنم آسا بنا دیا ہے۔ یہاں بھائی کا بھائی گلا کاٹ رہا ہے اور پوری زمین انسانی خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ یہ ممالک کس افسوسناک صورتِ حال سے گزر رہے ہیں اور انسانی جان یہاں کتنی ازراں ہے اس کا اندازہ اس ایک چیز سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابھی حال ہی میں صرف انڈونیشیا کی حدود میں دس لاکھ جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بد نصیب خطے کے رہنے والے فطرتاً امن و چین کے دشمن اور خون خرابے کے چاہنے والے ہیں؟ انسان خواہ اس کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے طبعاً امن پسند اور عافیت کوش ہوتا ہے۔ لڑائی جھگڑے سے اسے فطری طور پر نفرت ہے اور وہ اگر کبھی یہ طرز عمل اختیار کرتا ہے تو یہ اُس کی فطرت نہیں بلکہ فطرت سے بغاوت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا مشرق میں امن پسند انسان کی فطرت مسخ ہو گئی ہے اور اُس نے صلح اور آشتی کی راہ چھوڑ کر بغاوت اور قتل و غارت کا شیعہ اختیار کر لیا ہے؟ ہمیں مشرقی انسان کی فطرت میں قطعاً کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ وہ خیر اور بھائی کا جو یا اور امن و چین کا آرزو مند ہے لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات و تمناؤں کے مزارینا کر ان کے گرد سادھووں اور جوگیوں کی طرح دنیا اور اس کے معاملات سے یکسر بے تعلق ہو کر نہ بیٹھے بلکہ اپنی خواہش اور آرزو کے مطابق اپنی دنیا تعمیر کرے لیکن جب کچھ طاقتور اور چالاک افراد اور قومیں محض اقتدار کے نشے میں اندھے بہرے تشدد سے کام لے کر ان آرزوں کو پروان نہیں چڑھنے دیتے تو وہ پھر مضطرب ہو کر بھڑک اٹھتا ہے اور اپنے اس اضطراب کے اظہار کے لیے جب سارے راستے مسدود پاتا ہے تو غیر آئینی حرکات پر اتر آتا ہے۔ برسرِ اقتدار طبقے اس بے چارے کی اسل پریشانی اور اس کے حقیقی اسباب پر تو غور نہیں کرتے اور محض قوت سے اسے دباتے ہیں جس کے نتیجے میں خوفناک قسم کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں جہاں عوام کے احساسات و جذبات کو نظر انداز کر کے اُن پر اُن کی مرضی کے خلاف کوئی چیز ٹھونسی گئی یا اُن کے مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے انہیں صرف دلکش نغروں سے بہلائے پر اکتفا کیا گیا وہیں ان کے اندر تلخی پیدا ہونی شروع ہوتی۔ زندگی کے حقائق بڑے ٹھوس ہیں اور انہیں صرف خوش کن باتیں کر کے ہوا میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ مشرق کے حکمران تہذیبی جلدی اس حقیقت کو سمجھ

جائیں اتنا ہی یہ حاکم و محکوم دونوں کے حق میں بہتر اور مفید ہوگا۔

جماعت کے کام کی راہ میں خارجی موانع کے تذکرے کے بعد مجلس شوریٰ کی کارروائی میں جو دوسری اہم چیز سامنے آئی ہے وہ بیرون ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے کام کی اشد ضرورت کا احساس اور جو کام پہلے سے ہو رہا ہے اُس کی تنظیم ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی مجموعی آبادی کم سے کم اندازے کے مطابق باون کروڑ گیارہ لاکھ اسی ہزار افراد پر مشتمل ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہے مشرق وسطیٰ اور اُس کے متصل علاقوں اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاوہ افریقہ کے متعدد حصے ایسے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں خصوصاً شمالی، وسطی اور مغربی افریقہ میں تو مسلمانوں کا تناسب بڑی غالب اکثریت ہے۔ بد قسمتی سے یہ ساری آبادیاں اب تک مدت دراز تک مغربی سامراجیت کا شکار رہیں جنہوں نے انہیں بڑی بے دردی کے ساتھ تاخت و تاراج کیا لیکن اب آزاد ہونے کے بعد جبکہ ان کے اندر حرکت و حرارت پیدا ہو رہی ہے تو انہوں نے اپنے اُس مذہب پر بھی غور کیا ہے جو ان کی قوت کا واحد سرچشمہ ہے اور جس کی برکت سے وہ صدیوں کی غلامی کے باوجود اپنے توغنی شخص کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیوں نے بھی اس امر کو بڑی طرح محسوس کیا ہے کہ ان ممالک کی آزادی کے بعد اگر ان کے سامراجی عزائم کی تکمیل کی اب کوئی صورت ممکن ہے تو وہ یہی ہے کہ انہیں عیسائیت کے دام میں پھانس کر فکر و نظر کے اعتبار سے آزاد نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ عیسائیوں کے بڑے بڑے مشن زبردست تیاریوں کے ساتھ اور لاتعداد وسائل جمع کر کے اب افریقہ کا رخ کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے حالات کی اس سنگینی کے پیش نظر گذشتہ سال اس امر کا فیصلہ کیا کہ چوہدری غلام محمد صاحب افریقہ کا دورہ کر کے ساری صورت حال کا جائزہ لیں اور پھر ان سب ممالک میں تبلیغ دین کا جو کام ہو رہا ہے اُس کے متعلق رپورٹ پیش کریں چنانچہ چوہدری صاحب نے گذشتہ سال ہی مشرقی افریقہ کا دورہ کیا اور تقریباً ایک ماہ اس علاقے میں رہ کر مقامی باشندوں اور ایشیائی مسلمانوں سے مل کر وہاں کے حالات و کیفیات جمع

کئے اور پھر کام کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں قرآن مجید کے سوا اعلیٰ اور برگزیدہ ترجمہ کی اشاعت، انگریزی اور سوا اعلیٰ میں اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اشاعت، سوا اعلیٰ زبان میں ایک ماہ نامے کا اجراء اور دارالعلوم کا قیام شامل ہے۔ اس سال مجلس شوریٰ نے اس منصوبے کے تحت جو کام ہو رہا ہے اس کا جائزہ لیا، تو اللہ تعالیٰ کی نوازش سے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ سوا اعلیٰ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ و بیانات کا ترجمہ بھی طباعت کی منزل میں ہے۔

چوہدری صاحب نے افریقہ کے بعد ترکی کا دورہ کیا اور اسلام کے احیاء کے لیے جو کوششیں وہاں ہو رہی ہیں ان کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اپنے تاثرات مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیے ہیں:

”ترکی میں اگرچہ تحریک اسلامی کو سخت نامساعد حالات کا سامنا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور روس اور مغربی ممالک کی سازشیں جاری ہیں۔ یہودیوں کے بین الاقوامی ادارے **FREE MASON** تحریک کا گرہ ہے۔ لیکن گزشتہ پندرہ سولہ سال کی تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ تحریک اسلامی خاصی گہری اور مضبوط جڑیں رکھتی ہے اور اگر ان کو اس وقت مدد پہنچ جائے تو انشاء اللہ یہ قوت پکڑ کر حالات کو بدل سکتی ہے۔ ان کی مدد صرف ٹیچر کی تیاری اور طباعت کے میدان میں درکار ہے۔ اگر ان لوگوں کو اپنا پرس بھی میسر آجائے تو مزید سہولت ہو سکتی ہے۔ علامہ بدیع الزمان سعید نورسی رحمہ اللہ کی کتابیں اب طبع ہو کر شائع ہو رہی ہیں۔ مگر یہ سارا لٹریچر مغربی تہذیب کے پیدا کردہ جھنجھکاؤ کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اب کچھ کتابیں سید قطبؒ (اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی قبروں کو نور سے بھر دے) کی ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کی چند فکر انگیز کتب اور رسائل مثلاً دین حق، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، کلمہ شہادت، اسلام کا نظام حیات اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر، انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل، سرود، اور اسلام اور ضبط و ولادت بھی ترکی میں شائع ہو چکی ہیں۔

دنیا تے اسلام کو اس وقت جو متعدد مسائل درپیش ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ ان مسلمانوں کے تہذیبی تحفظ کا مسئلہ ہے جو معاشی یا تعلیم یا کسی دوسری غرض کے لیے مغربی ممالک میں آباد ہیں۔ ان میں سے اگرچہ ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہیں اسلام کی ہر چیز سے بوجہ اور مغرب کی ہر اداسند ہے ایسے لوگ اگر مغربی سوسائٹی میں مدغم ہو جائیں تو یہ قطعاً کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً اخبارات یا خبر رساں ایجنسیوں سے ان مغربی ممالک کے مسلمان باشندوں کے جو تاثرات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عظیم تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اسلام اور اس کے شعائر سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتے اور وہ اپنی اولاد کو بھی اسلام کا حلقہ گوش رکھنا چاہتے ہیں پھر ایک اچھی خاصی تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی ہے جو اگرچہ اسلام سے محبت رکھتے ہیں مگر کسی دینی تنظیم کے نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ مغربی سوسائٹی کی برائیوں کو قبول کرتے جا رہے ہیں اور ان کے اندر احساسِ زیاں مٹا جا رہا ہے۔ جماعتِ اسلامی ان حالات کو ایک مدت سے بنگاہِ تشویش دیکھتی رہی ہے اور مغربی ممالک خصوصاً انگلستان میں دعوت و تبلیغ کے مقدس کام کو شروع کرنے کی خواہشمند رہی ہے۔ چنانچہ اجمالاً چوبہری صاحب اور پروفیسر خورشید صاحب نے اس سلسلہ میں ان ممالک کا دورہ کیا اور مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سے خطاب کیا اور وہاں کی اہم علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ پروفیسر خورشید صاحب اسی سلسلے میں مغربی جرمنی بھی تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اسلام اور تحریکِ اسلامی کا تعارف کر دیا۔ انگلستان کے مسلمانوں کو ایک مضبوط دینی تنظیم قائم کرنے اور پھر انہیں اس کے ساتھ وابستہ ہونے کی ضرورت کا احساس دلا یا گیا۔ اسی مقصد کے لیے یو کے اسلامک مشن لندن کو اب نئے نئے عزام اور نئی امنگوں کے ساتھ منظم کیا جا رہا ہے تاکہ وہ ایک طرہ تو دعوتِ دین کا کام کرے اور دوسری طرف وہاں کے مسلمان باشندوں کے دینی احساسات کو زندہ رکھنے کے لیے ہر میدان میں جدوجہد کرے۔

مجلسِ شوریٰ نے اپنے اس حالیہ اجلاس میں ملک کی تشویشناک اقتصادی صورتِ حال پر بھی سوچ بچار کیا ہے اور ایک قرارداد میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ملک معاشی اعتبار سے اس وقت نہایت پریشان کن مسائل

سے دوچار ہے جنہیں اگر صحیح بیج پر عمل کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو صورت حال زیادہ تشویشناک ہو جائے گی۔ اربابِ اختیار معاشی ترقی کے بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں، اور پروجیکٹوں کے ذریعہ عوام کو یہ باور دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملک معاشی میدان میں حیرت انگیز ترقی کر رہا ہے، لیکن جب ہم اس نام نہاد ترقی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض اعداد و شمار کی فریب کاری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ملک کے چند خاندان دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی نہیں بلکہ ارب پتی بن گئے ہیں۔ مگر ملک کی عظیم اکثریت بہت بری طرح پس رہی ہے۔ ایشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور ہوشیار گرائی نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔

معاشی ترقی اور خوشحالی کوئی ایسی غیر مٹی حقیقت نہیں ہوتی جسے دیکھا اور محسوس نہ کیا جاسکتا ہو ایک عام آدمی جو علم معیشت کی ایجاد سے بھی واقف نہ ہو وہ بھی معاشی ترقی کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ عام باشندوں کو ضروریات زندگی مہیا ہونے لگیں، یا با الفاظِ دیگر لوگوں کی ضرورت کی چیزیں فراوانی کے ساتھ ہر جگہ پانا میں موجود بھی ہوں اور لوگ ان کو خریدنے کے قابل بھی ہوں۔ لیکن ہمارے ہاں ترقی کا یہ عجیب انداز ہے کہ سرکاری اطلاعات کی رُو سے تو ملک زبردست معاشی ترقی کر رہا ہے، اور عام آدمی کا تجربہ و مشاہدہ یہ خبر دے رہا ہے کہ لوگ روز بروز زیادہ تنگ حال ہوتے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب ملک میں سرمایہ کاری (INVESTMENT) زیادہ ہوگی تو اس سے قیمتوں میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے۔ چلیے ہم اس بات کو بھی وقتی طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن سرمایہ کاری کا یہ اثر تو لازمی طور پر ہونا کرتا ہے کہ ملک میں بیروزگاری کم ہونے لگتی ہے۔ ہمارے ہاں آخر وہ کیسی سرمایہ کاری ہو رہی ہے جس سے لوگوں کو روزگار ملنے کے بجائے اٹنی بیروزگاری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آج کا نوجوان جس طرح بیروزگاری کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے خود یہ مصیبت دیکھی ہو۔ وہ بے چارا تلاشِ روزگار کے لیے مختلف ذمہ داریوں کے چکر کاٹتا ہے اور در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن اُسے کام نہیں ملتا۔ عوام روٹی کے ایک ایک لقمے کے محتاج ہیں۔ ان کے پاس اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کے وسائل بھی نہیں۔ ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف معاشی بد عنوانیاں ملک کے نظام حیات کا جزو بن گئی ہیں۔ رشوت کے بغیر کسی سرکاری محکمے سے لوگوں کا کوئی کام نہیں نکلتا۔ عوام کو اپنے جائز حقوق

ہمک کے حصول کے لیے حکام کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ سُود کی لعنت پہلے سے کہیں زیادہ ہماری معیشت پر مسلط ہے۔ اور اس وجہ سے ملکی دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ خرابیاں اتنی واضح اور اتنی لاتعداد ہیں کہ اس ملک کا ہر فرد ان کا نہ صرف اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے بلکہ ان سے اُسے خود سبز لمحہ سابقہ پڑتا ہے۔

ان حالات میں ہم اصحابِ اقتدار سے یہی گزارش کریں گے کہ ان تلخ حقائق کو محض اغیار کے ظنوں پر محمول کر کے نظر انداز نہ کریں اور اس غلط فہمی میں مبتلانہ ہوں کہ صرف معاشی ترقی کا پورا پکینڈہ اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ عوام کی تلخیوں کو دُور کر دینا۔ زندگی بڑے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے اور خوش کن اعداد و شمار کے چکر اور نعرہ بازیاں انہیں کا فور نہیں کر سکتیں۔ پھر انہیں اس تلخ حقیقت سے بھی صرف نظر نہ کرنا چاہیے کہ دورِ جدید میں کسی معاشرے کے اندر معاشی بد حالی کا بڑھنا، اخلاقی حدود و قیود کا ٹوٹنا، اور امیری وغریبی کے درمیان فرق و امتیاز میں روز بروز اضافہ ہونا، یہ وہ علامات ہیں جو کسی بہت بڑے طوفان کا پتہ دیتی ہیں۔ ایسی ہی فضا اور ایسے ہی ماحول میں بعض طحڑانہ تحریری تحریکات سرعت کے ساتھ پھلتی پھوٹی اور برگ و بار لاتی ہیں۔ اس معاملے میں ایک لمحہ کے لیے بھی غفلت نہ کرنی چاہیے بلکہ اسلام کے معاشی اصولوں کو صدقِ دل کے ساتھ اپنا کر معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی ان خرابیوں کا تدارک کرنا چاہیے۔ خدا نہ کرے کہ ہماری غفلت کی وجہ سے تخریب و انحاد کا سیلاب ہمیں برباد کر کے رکھ دے۔

مختلف مسلم و غیر مسلم ممالک میں آج اسلام اور اہل اسلام پر جو بیتِ ربی ہے مجلسِ شہرئی نے اس کا بھی جائزہ لیا ہے اور اس معاملے میں اپنے موقف کی نہایت دانشگاہانہ وضاحت کی ہے۔ یوں تو شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جس میں اسلام اور اس کے نام لیواؤں کے لیے فضا سازگار ہو لیکن خاص طور پر مصر، اریٹریا، یمن، کشمیر اور برما میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ انتہائی افسوسناک اور قابلِ مذمت ہے۔

مصر میں اغوان المسلمون کا کرنل ناصر کے ہاتھوں جو شہر ٹوٹا ہے اور یمن میں اغوانیوں پر ظلم و ستم کے جو

پہاڑ توڑے گئے ہیں وہ استبداد کی تاریخ کا ایک انتہائی سیاہ باب ہے۔ اسلام کے فدائوں اور ملت کے ہی خواہوں کو بغیر کسی قصور کے تختہ دار پر لٹکا دینا اور جیلوں میں بند کر کے انہیں نہایت خوفناک قسم کی سزائیں دینا انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ مجلس شوریٰ نے اس صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایریٹریا کی مسلم آبادی پر حبشہ کے عیسائی حکمران کے مظالم کی بھی مجلس نے مذمت کی ہے۔ اور اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ کم از کم اپنی ان قراردادوں کا تو کچھ پاس کرے جو اس نے اس بد نصیب ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت خود منظور کی تھیں۔ حبشہ کا عیسائی حکمران ہیلا سلاسی اقوام متحدہ کے فیصلوں اور انسانی اور جمہوری تقاضوں کو کیسے نظر انداز کر کے محض طاقت کے بل پر نہ صرف ایریٹریا کو حبشہ میں ضم کرنے کے درپے ہے بلکہ فرانس صومالیہ کو بھی ٹرپ کرنے کی فکر میں ہے۔

بین میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی خونریزی و خانہ بربادی پر بھی مجلس نے دلی رنج و قلق کا اظہار کیا ہے۔ درحقیقت یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ ایک عرب ملک جو ابھی خود مغربی استعمار کے چنگل سے نکلا ہے، آج ایک استعماری طاقت بننے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی فوجیں اس کی اپنی سرزمین سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر یمن میں کشت و خون اور غارت گری کر رہی ہیں، جس کے لیے کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ حرکت ایسی حالت میں کی جا رہی ہے جبکہ اسرائیل کا خطرہ مشرق وسطیٰ میں تمام عرب ملکوں کے سر پر منڈلا رہا ہے۔

برامیں فوجی آمریت اور سوشلزم کے مرکب نے مسلمانوں پر جو ظلم ڈھا رکھا ہے اس کی طرف بھی مجلس شوریٰ نے دنیا کی تمام مسلم حکومتوں اور قوموں کو توجہ دلائی ہے تاکہ وہ اس ظلم کو ختم کرانے کے لیے اپنا اخلاقی اثر استعمال کریں۔

کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان اور بین الاقوامی طاقتوں کے طرز عمل کا جائزہ لیتے ہوئے مجلس شوریٰ نے حکومت پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ اولاً، اعلان تاقصد کی ناکامی کا اعلان کر کے سلامتی کونسل سے مطالبہ کرے کہ جن شرائط پر ستمبر ۱۹۷۱ء میں جنگ بند کرائی گئی تھی ان کو اب پورا کیا جائے۔ ثانیاً وہ پرامن طریقوں سے مسئلہ کشمیر کے حل کی کوششوں کے لیے کوئی حد مقرر کرے، اور ثالثاً وہ اس مسئلے کو آخری اور

(باقی صفحہ پر)

(بقیہ اشارات)

قطعاً حل کے لیے قوم کو تیار کرے۔

مجلس شوریٰ نے الاخوان المسلمون پر ظلم و ستم، اریٹیریا کی حالت زار، یمن کی خانہ جنگی، کشمیر کی دردناک صورت حال اور برما کے مسلمانوں کی مطلوبیت پر جو مختلف قراردادیں پاس کی ہیں وہ کوئی ایسے تاثرات نہیں جنہوں نے دفعتاً الفاظ کی صورت اختیار کر لی ہو۔ ان ممالک میں یہ خونخوئی ڈرامہ پوری دنیا کے سامنے کھیلا جا رہا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ مہذب دنیا جس نے جانوروں پر بے رحمی کے انداد کے لیے بڑے بڑے محکمے اور ادارے قائم کر رکھے ہیں، ان ممالک کی آبادیوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر قطعاً متاثر نہیں ہوتی۔ کیا مسلمان انسان نہیں؟ کیا ظلم و استبداد سے انہیں تکلیف نہیں پہنچتی؟ کیا قتل و غارت سے ان کی نسلیں اور آبادیاں برباد نہیں ہوتیں؟ ظلم بہر حال ظلم ہے خواہ وہ کوریا میں کیا جائے یا ویتنام میں یا کشمیر میں۔ اور انسانی جان ہر جگہ قابل احترام ہے خواہ وہ مصر کی ہو یا امریکہ اور روس کی۔ لیکن دنیا کی روش دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے نزدیک مسلمان کے خون، اُس کی عزت و آبرو کی کوئی قیمت نہیں جو سر پھرا جس وقت چاہے اس کا خون بہائے، اور اس کا گھر برباد کر دے۔ ایشیا کی دنیا ہو یا مغربی دنیا، دونوں طرف کسی دل میں بھی اس پر کوئی اضطراب برپا نہیں ہوتی جن لوگوں کی تنگ نظری کا یہ عالم ہو کہ انہیں مسلم قوم پر ڈھائے جاتے والے لڑخیز مظالم بھی نظر نہ آتے ہوں اور جن کے دل تعصبات کی وجہ سے اتنے بے حس اور شستی ہو گئے ہوں کہ اس قوم کی آہیں اور نالے ان کے احساسِ مردہ کہ جگانہ ملکتے ہوں، اُن سے انسانیت اگر کسی خیر کی توقع رکھتی ہے تو یہ محض ابلہ فریبی ہے جن لوگوں کی انسانیت مسخ ہو جائے اُن سے فلاح و کاروائی کی امیدیں وابستہ کرنا پرے درجے کی حماقت اور بیوقوفی ہے۔

ادارہ بٹول، ایچ ۹
لاہور
نقشہ
۲۰۰ صفحات
۲۰ روپے
منظر عام پر آئیگی
بھونری
۶۶
انجمن تبلیغ
بٹول
۹ سالنامہ
کا